52 Toor بسم اللہ الرحمن الرحیم Makky

Aayaath 49

سُورَۂ طُورْ

یہ سورہ مکی ہے اس میں انچاس ۴۹ آیتیں ۔ تین سو بارہ ۳۱۲ کلمے ۔ اور پندرہ سو ۱۵۰۰ حروف ہیں (تفسیر نیشاپوری)

امام بخاریؒ و امام مسلمؒ وغیرہ نے جبیر بن مطعمؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں "سورۂ طور" پڑھتے ہوئے سنا ۔ دوسری روایت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پہلو میں نماز ادا فرما رہے تھے اور اس میں سورۂ طور کی قراءت فرما رہے تھے۔[1]

اس سورۃ کو اگلی سورۃ سے یہ مناسبت ہے کہ یہ دونوں سورتیں قسم سے شروع ہوئی ہیں اور ان دونوں میں حشر کا بیان ہے۔ اس سورۃ کا اول حصہ اگلی سورۃ کے آخر سے یہ مناسبت رکھتا ہے کہ اگلی سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "فویلٌ للذین کفروا"

---

[1] تفسیر فتح القدیر جلد پنجم صـ ۹۱

اور اس سورۃ کے شروع میں " فویل یومئذ للمکذبین " نیز اگلی سورۃ کے آخر میں " فان للذین ظلموا ذنوباً " ارشاد ہوا تھا جس میں عذاب کی طرف اشارہ ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہوگا۔[1]

وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ وَّالْبَيْتِ 2- 1 2- 2
52- الْمَعْمُوْرِ ۙ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ اِنَّ 2- 4 2-5
52 عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ
52- 52- مَوْرًا ۙ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۭ فَوَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ 2-8 2-10
52-1 52-1 الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى 2- 12
52- 1 نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۭ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ
اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا 2-15 2- 16
اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

قسم ہے (کوہ) طور کی۔ اور کشادہ ورق پر لکھی ہوئی کتاب کی۔ اور بیت المعمور کی۔ اور بلند چھت کی۔ اور بھرپور دریا کی۔ بے شک

[1] تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ ۲۶۴ —

آپ کے رب کا عذاب ہو کر رہے گا۔ اس (عذاب) کا کوئی ٹالنے والا نہیں۔ جس دن آسمان لرزنے لگے گا اور پہاڑ چلنے لگیں گے۔ پس اس دن جھٹلانے والوں کے لئے افسوس ہے جو (اپنی) بیہودہ گوئی سے کھیلتے ہیں جس دن وہ دوزخ کی آگ کی طرف دھکے دے کر لائے جائیں گے۔ (اور ان سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (اب بتاؤ) کیا یہ جادو ہے یا تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس میں داخل ہو۔ خواہ تم صبر کرو یا نہ کرو تمہارے لئے دونوں یکساں ہیں۔ یہ تمہیں محض تمہارے کرتوت کی سزا مل رہی ہے۔

اس سے پہلی سورۃ میں روز قیامت کا بیان فرمایا تھا کہ آپ کے منکرین بھی اگلی امتوں کے منکرین کے ساتھ رہیں گے کیوں کہ آپ کے ساتھ ان کا طرز عمل بھی وہی ہے جو اگلی امتوں کے منکرین کا اپنے پیغمبروں کے ساتھ تھا۔ اس لئے ان دونوں کا ایک ہی حشر اور ایک ہی انجام ہو گا۔ اب اس سورۃ میں عذاب قیامت کا بیان ہے اور اس کو حسب ذیل پانچ قسموں کے ساتھ بیان فرمایا تاکہ منکرین کے

مقابلہ میں اتمام حجت ہو۔ اور جو لوگ قبول حق کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ ان چیزوں پر غور و فکر کریں اور خدا کی قدرت و عظمت اور کمالِ حکمت سے متاثر ہو کر راہ راست اختیار کریں اور عذابِ آخرت سے بچیں :-

(۱) طور کی قسم (۲) کشادہ اوراق پر لکھی ہوئی کتاب کی قسم
(۳) آباد گھر کی قسم (۴) اونچی چھت کی قسم اور
(۵) بھرپور دریا کی قسم۔

وَالطُّوْرِ اس کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جس پہاڑ پر درخت ہوں اس کو طور کہتے ہیں جیسے وہ پہاڑ جس پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا تھا۔ اور جس پہاڑ پر درخت نہ ہوں اُسے طور نہیں کہتے بلکہ جبل کہتے ہیں۔ قاضی بیضاوی بھی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس سے مراد طور سینا ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ کتاب مسطور کی تفسیر میں حافظ

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بعض لوگ اس سے مراد لوح محفوظ لیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جو لکھی ہوئی نازل ہوئیں اور لوگوں کے سامنے بالجہر پڑھی جاتی ہیں۔ اس لئے "رقّ منشور" فرمایا گیا۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ کتاب مسطور سے مکتوب مراد ہے۔ کیوں کہ حروف مکتوبہ کی ترتیب کو سطر کہتے ہیں۔ والمراد بہ القرآن او ما کتبہ اللہ تعالٰی فی لوح المحفوظ او فی الواح موسٰی او فی قلوب الاولیاء من المعارف والحکم۔ او ما یکتبہ الحفظۃ فی رق منشور الرق الجلد الذی یکتب فیہ استعیر لما کتب فیہ الکتب۔ یعنی اس سے مراد قرآن [1] یا وہ کتاب [2] ہے جو لوحِ محفوظ پر لکھی ہوئی ہے۔ یا اس سے مراد حضرت موسٰیؑ کے الواح [3] ہیں (یعنی وہ تختیاں جن پر توریت کے احکام عشرہ لکھے ہوئے حضرت موسٰیؑ کو عطا ہوئے تھے) یا اس سے مراد وہ معرفتیں [4] اور حکمتیں ہیں جو اولیاء کے قلوب پر خدا کی طرف سے وارد ہوتی ہیں یا اس سے مراد وہ تحریر [5] ہے جو کھلے ہوئے کاغذ پر لکھی جاتی ہے۔ رق اصل میں

اس (باریک) کھال کو کہتے ہیں جس پر لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد استعارۃً ہر اس چیز کو کہنے لگے جس پر کتابیں لکھی جائیں۔ حافظ ابن کثیر اور قاضی بیضاوی دونوں نے کتاب کا تعین نہیں فرمایا۔ مگر بعض مفسرین نے کتاب سے توریت مراد لی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ طور کے بعد چونکہ کتاب مسطور کی قسم کھائی گئی ہے اس لئے کتاب سے یہاں وہی کتاب مراد ہے جو طور پر نازل ہوئی تھی اور وہ توریت ہے مگر فقیر کے خیال میں تعین کتاب کے لئے اس سے بھی زیادہ واضح قرینہ موجود ہے۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں پانچ چیزوں کی قسم کھائی ہے اور ان پانچوں میں سے سوا کتاب کے باقی چار پر لام تعریف داخل فرمایا ہے اور علم بلاغت کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب کوئی چیز بغیر تخصیص کے مطلق بیان کی جاتی ہے تو اس سے مراد فرد کامل ہوتا ہے نیز جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے اس پر مخاطب کو نظر عبرت سے دیکھنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے ان دونوں امور کو پیش نظر رکھو تو کتاب کا تعین ایک صاف اور کھلی ہوئی بات ہے کیوں کہ جس وقت قرآن حکیم نازل ہوا کوئی

آسمانی کتاب اپنی اصلی حالت میں موجود ہی نہ تھی لہذا یہ ایسی کتاب ہونی چاہئے جس تک ایک متلاشی حق کی رسائی ہو سکے اور وہ اس پر غور و فکر کرے تو اس سے خدا کی قدرت۔ عظمت اور کمال حکمت ظاہر ہو سکے اور یہ مقصد سوائے قرآن حکیم کے اور کسی چیز سے پورا نہیں ہو سکتا لہذا یہاں جس کتاب کی قسم کھائی گئی ہے اس سے مراد کوئی محرف اور منسوخ کتاب نہیں بلکہ قرآن حکیم اور صرف قران حکیم ہے۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین جس کتاب کو شعر یا سحر کہتے یا جس سے روگردانی کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں وہ خدا کے پاس اتنی معظم ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کی قسم کھاتا ہے واللہ اعلم و علمہ اتم۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ صحیحین یعنی بخاری و مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر تشریف فرما ہوئے تو آپ فرماتے ہیں کہ پھر مجھے "بیت المعمور" کی طرف بلند کیا گیا اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں یعنی وہاں نماز پڑھتے اور

طواف کرتے ہیں اور وہ پھر اس کی طرف کبھی واپس نہیں آتے اور
جس طرح زمین والے کعبہ کا طواف کرتے ہیں اسی طرح فرشتے بھی
بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔ بیت المعمور ساتویں آسمان کا
کعبہ ہے۔ اسی سبب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور سے
ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے کیوں کہ آپ کعبہ ارضی کے بانی ہیں اس لئے
آپ کو جزا بھی عمل ہی کی جنس سے دی گئی ہے اور وہ (بیت المعمور)
کعبہ کے مقابل ہے۔ ہر آسمان پر (خدا کا) ایک گھر ہے جہاں اس
آسمان کے رہنے والے عبادت کرتے ہیں اور اس کی طرف رخ کر کے
نماز پڑھتے ہیں اور دنیا کے آسمان پر جو خدا کا گھر (یعنی قبلہ) ہے
اس کو بیت العزت کہتے ہیں۔

عاصم بن ربیعہ سے مروی ہے کہ ابن کواء نے حضرت سیدنا
علی کرم اللہ وجہہ سے بیت المعمور کی نسبت سوال کیا تو آپ نے
فرمایا کہ آسمان پر ایک مسجد ہے جو "صراح" کہلاتی ہے اور اس میں
ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور وہ پھر کبھی واپس نہیں آتے۔
عوفی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ بیت المعمور عرش کے

محاذی ایک گھر ہے جو فرشتوں سے آباد ہے۔ ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں اور یہ فرشتے پھر کبھی اس کی طرف واپس نہیں آتے۔

وَالسَّقۡفِ الۡمَرۡفُوۡعِ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد آسمان ہے اور ربیع بن انس کہتے ہیں کہ اس سے مراد عرش ہے جو تمام مخلوقات کی چھت ہے۔

وَالۡبَحۡرِ الۡمَسۡجُوۡرِ ربیع بن انسؓ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو عرش کے تحت ہے اور جمہور کا قول ہے کہ اس سے مراد یہی سمندر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان پانچ چیزوں کی قسم کھا کر فرماتا ہے کہ

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ یعنی جو لوگ مستحق عذاب ہیں ان پر آخرت میں آپ کے رب کا عذاب ہوگا اور ضرور ہوگا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

جبیرؓ بن مطعم روایت کرتے ہیں کہ جس وقت بدر کے قیدی

مدینے میں لائے گئے ہیں تو میں بھی انھیں میں تھا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مغرب کی نماز ادا فرما رہے تھے جب آپ نے ان عذاب ربك لواقع کی قرأت فرمائی تو میرا دل لرز گیا[1]

مَا لَهُ مِن دَافِعٍ اس عذاب الٰہی کو کوئی طاقت ان کے سر سے ہٹا نہ سکے گی یعنی منکرین کا یہ عذاب اٹل اور دائمی ہے اس کے بعد یوم قیامت کی تشریح فرماتا ہے

يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا یعنی وہ دن ایسا ہو گا کہ آسمان لرزنے لگیں گے یعنی جس دن سطوت الٰہی اور قہر خداوندی کے آگے آسمان بھی لرزہ بر اندام ہو جائیں گے تو انسان ضعیف البنیان کی کیا حقیقت ہے

وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور اس طرح چلنے لگیں گے جیسے ابر چلتا ہے کشش اتصال و کشش ثقل دونوں باقی نہ رہیں گی جس کے

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ششم صفحہ ۱۱۸ ۔

سبب سے یہ موجودہ نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ آسمان کی اس حالت کے بیان سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عموماً انسان قلعہ میں پناہ لیتا ہے اور سب سے مضبوط قلعہ وہ سمجھا جاتا ہے جو پہاڑوں سے محصور ہو خصوصاً عرب ایسی پناہ گاہوں پر فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ سموأل عادی بڑے فخر سے کہتا ہے کہ: ؎

لنا جبل یحتلہ من نجیرہ	منیف یرد الطرف کلیلہ

یعنی ہمارا ایک پہاڑ ہے ہم جس کسی کو پناہ دیتے ہیں وہ وہیں اترتا ہے۔ وہ پہاڑ اتنا بلند ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھ اس کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتی بلکہ تھک کر واپس ہوجاتی ہے۔

جب بروز قیامت پہاڑوں کی یہ حالت ہوگی اور اس عالم کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا اس روز ان منکرین کی حالت کے متعلق فرماتا ہے کہ

فَوَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ	ویل کلمۃ تقال للھالک واسم وادٍ فی جھنم۔ یعنی ویل ایسا

کلمہ ہے جو ہلاک ہونے والے کے لئے کہا جاتا ہے نیز ویل دوزخ کی ایک وادی کا بھی نام ہے یعنی اس روز ان جھٹلانے والوں کی حالت نہایت افسوس ناک ہوگی۔ پھر ان منکرین کا دوسرا وصف بیان فرماتا ہے کہ

الَّذِينَ هُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ

یہ اپنی بیہودہ گوئی سے کھیلتے ہیں یعنی باطل میں تردد کرتے ہیں اور اسی میں پڑے ہوئے ہیں نہ تو یہ یوم حساب کو یاد کرتے ہیں نہ عذاب آخرت سے ڈرتے ہیں خدا نے ان کو عقل و خرد عطا کی تھی تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کریں اور طاعت و معصیت کے نتائج پر غور کریں مگر یہ اس عقل سے غلط کام لیتے اور اللہ کے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب و استہزاء میں غور و فکر کرتے ہیں سوچ سوچ کر قسم قسم کی بیہودہ باتیں کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ منکرین اسباب دنیوی میں غور کرتے اور آخرت سے منہ موڑ لیتے ہیں ان کی اس بیہودگی سے خدا یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ان کو اس روز معلوم ہوگا جب

يَوْمَ يُدَعُّونَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا

الدع الدفع بعنف

وجفوۃ یعنی اس روز ان کو سخت دھکے دے کر دوزخ کی آگ میں ڈھکیل دیا جائے گا اور اس بے بسی کے عالم میں دوزخ کے فرشتے ان سے کہیں گے کہ

یہی وہ آگ ہے جس کو تم دُنیا میں جھٹلایا کرتے تھے۔	هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ

اے منکرینِ خدا اور رسولؐ! دنیا میں تو تمہاری یہ حالت تھی کہ تم خدا کے رسُولؐ کو گستاخی اور دریدہ دہنی سے ساحر کہہ دیا کرتے تھے خدا کا کلام جو تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا تو اس کی اعجاز بیانی اور ہدایت ربّانی کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی بجائے تم نے اس کو سحر کہہ دیا اسی طرح خدا کی ہر وہ نشانی جو تمہاری ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھی جب تمہارے سامنے پیش ہوئی اور تم اس کا معارضہ اور مقابلہ نہ کر سکے تو اس کو جادو اور اس کے پیش کرنے والے کو جادوگر کہہ دیا اب یہ جہنم کی آگ تمہارے سامنے ہے بتاؤ تو

کیا یہ بھی جادو اور محض نظر بندی کا کھیل ہے یا	أَفَسِحْرٌ هٰذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ

یہ وہی آگ ہے جس سے تم کو دنیا میں ڈرایا گیا تھا۔ مگر تم برابر اس کا انکار کرتے رہے کیوں اب نبائے کیوں نہیں کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا اب

اِصۡلَوۡهَا فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا ۚ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ	اس آگ میں داخل ہو جاؤ۔

تم اس کی تکلیف کو برداشت کر سکو یا نہ کر سکو اس وقت یہاں دونوں یکساں ہیں کیوں کہ یہ سزا تمہارے صبر و تحمل کے لحاظ سے نہیں دی جا رہی ہے بلکہ

اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ	محض تمہارے کرتوت کا بدلہ تم کو دیا جا رہا ہے جو خدا کے

حکم سے تمہارے لئے مقدر کر دیا گیا ہے یہ ظلم نہیں عین انصاف ہے۔ تم سے اللہ نے قسمیں کھا کھا کر بیان کیا مگر تم کو یقین نہ آیا تم برابر تکذیب و انکار کرتے رہے اب تمہارے کفر و معصیت کا یہ بدلہ حسب وعدہ تم کو مل رہا ہے جو عین معدلت ہے۔

اہل دوزخ یعنی منکرین و مکذبین کے انجام اخروی کو بیان

فرمانے کے بعد اب مومنین و متقین کا انجام اخروی بیان فرماتا ہے
کہ جن بندوں نے اس دنیا میں شرک و معصیت سے پرہیز کیا ان کو
اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کیسا انعام و اکرام دیا اور کن مراتب
سے سرفراز فرمایا۔ یعنی ترہیب کے بعد ترغیب ہے

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ۙ فَاكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ 52-17 52-18
وَوَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا 52-19
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۙ مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَصْفُوفَةٍ ۖ 52-20
وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ 52-21
ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ
مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ۝ وَأَمْدَدْنَاهُمْ 52-22
بِفَاكِهَةٍ وَلَحْمٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ ۝ يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا 52-23
لَا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ ۝ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَهُمْ 52-24
كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَكْنُونٌ ۝ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ 52-25
يَتَسَاءَلُونَ ۝ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۝ 52-26
فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ ۝ إِنَّا كُنَّا 52-27
52-28

مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ

بے شبہ پرہیزگار باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ وہ اپنے پروردگار
کے دیے ہوئے میوے کھاتے رہیں گے ان کا رب ان کو دوزخ کے
عذاب سے بچا لے گا (ان سے کہا جائے گا کہ) تم اپنے (نیک)
عمل کے بدلے (اب) مزے سے کھاؤ پیو۔ وہ ایک دوسرے کے
برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیوں سے (ٹیکہ) لگائے ہوئے بیٹھے
ہوں گے اور ہم ان کا بیاہ گوری اور بڑی آنکھوں والی عورتوں سے
کر دیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان
کے ساتھ ان کی پیروی کی (تو) ہم ان کی اولاد کو (بھی) ان کے
پاس پہونچا دیں گے اور ان کے عمل کی جزا سے کچھ نہ گھٹائیں گے
ہر شخص اپنے عمل کا رہین (یعنی گرو) ہے اور ہم ان کو ان کی حسب
خواہش پے در پے میوے اور گوشت دیتے رہیں گے۔ اور اس
(جنت) میں (ایسی پاک شراب ہے جس سے) بھرے ہوئے
پیالوں کے لئے وہ ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کریں گے جن
(پیالوں) میں نہ تو بے ہودہ گوئی ہے نہ گناہ ہے۔ اور ان کی

خدمت کے لئے ایسے (خوب صورت) لڑکے ان کے پاس چلتے پھرتے ہوں گے (کہ ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوگا) گویا وہ پوشیدہ موتی ہیں (اور اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر پوچھیں گے (اور وہ) کہیں گے کہ پہلے ہم کو اپنے اہل (یعنی خاندان کے بارے) میں ڈر تھا مگر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہم کو گرم ہوا (لُو) کے عذاب سے بچا لیا۔ بے شک ہم اس کی دعا کرتے تھے بے شک وہ (خُدا) محسن اور مہربان ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ

اس کی تفسیر میں حافظ ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے فرایض کو ادا کیا اور گناہوں سے پرہیز کیا وہ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ یہ آخرت کا بیان ہے۔

فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ

فاکہین سے مراد یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کے دئے ہوئے میوے بکثرت ہوں گے کیوں کہ عرب کے محاورہ میں جس کے پاس بہت

کھجور ہوں اس کو تامر اور جس کے پاس بہت سا دودھ ہو اس کو لابن کہتے ہیں۔

وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ان پرہیزگاروں کو پروردگار عذاب دوزخ سے

بچالے گا کیوں کہ دنیا میں ان کے نیک نیت اور طالب حق ہونے کی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے ان کو نفس و شیطان کے پنجے سے چھڑایا کفر و معصیت سے بچایا اور ایمان و عمل صالح کی توفیق عطا فرمائی جن سے ان میں نعمات جنت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور اسی صلاحیت کے لحاظ سے آج ان پر فیضان الٰہی ہو رہا ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی ان پرہیزگاروں سے جنت میں کہا

جائے گا کہ اے لوگو تمہارے پروردگار نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اسے خوب مزے سے کھاؤ اور خدا کی دی ہوئی پاک شراب پیو۔ اس میں کوئی گندگی وغیرہ نہیں ہے جیسے دنیا کے ماکولات و مشروبات میں ہوتی تھی۔ اور یہ نعمتیں تمہارے نیک اعمال کا بدلہ ہیں جو تم دنیا میں

کرتے تھے۔ اس کے بعد مزید نعمتوں کا بیان ہے کہ

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ	یعنی جنت میں تخت کے برابر تخت بچھے ہوئے ہوں گے اور

اہل جنت ان تختوں پر تکیہ سے ٹیکہ دئے ہوئے بادشاہوں کی طرح بیٹھے ہوں گے۔ پھر اس کے بعد اتمام مسرت اور تکمیل عیش کے لئے فرماتا ہے کہ

وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ	اور اہل جنت کا نکاح حوران جنت یعنی نہایت خوب صورت بہت

گوری اور بڑی آنکھوں والی عورتوں سے کردیں گے۔

خطیب شربینی لکھتے ہیں کہ اہل جنت کے اسباب تنعم کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ترتیب وار بیان فرمایا ہے۔ پہلے[۱] ان کا مسکن یعنی جنتوں کا بیان ہے۔ پھر اُن[۲] کے اکل و شرب کا ذکر ہے۔ پھر[۳] فرش و بسط کا ذکر ہے۔ اس[۴] کے بعد ان کے ازواج کا بیان ہے۔ ان میں سے ہر ایک امر اس کی کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے "فاکھین" فرمایا جس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کا عیش کبھی مکدر نہ ہوگا

اور اس سے مرتبے کی بلندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ عطیۂ خداوندی ہوگا۔ "کلوا واشربوا ھنیئاً" فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا انجام ہر طرح اطمینان بخش ہے۔ یہ ماکولات سوءِ ہضمی اور فضلہ وغیرہ کی گندگی سے پاک ہوں گے یعنی جنت میں اہل جنت کو جو ماکولات و مشروبات ملیں گے وہ اس دنیا کے ماکولات ومشروبات سے صرف اشتراک اسمی رکھتے ہیں ان کی حقیقت دنیوی ماکولات ومشروبات سے بالکلیہ الگ ہوگی۔ "کلوا واشربوا" کی تفصیل نہیں بیان فرمائی یہ اجمال اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ گوناگوں اور کثرت سے ہوں گے اور ان نعمتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ "بما کنتم تعملون" یہ اشارہ ہے کہ میں تمہارا رب اور خالق ہونے کے اور اپنے فضل وکرم سے تم کو جنت میں داخل کرنے کے باوجود بھی تم پر میرا کوئی احسان آج نہیں ہے بلکہ میرا احسان تم پر دنیا میں تھا کہ میں نے تمہیں ہدایت کی اور تم کو اعمال صالحہ کی توفیق دی جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بل اللہ یمنّ علیکم ان ھداکم للایمان۔ لہٰذا آج تم پر کوئی احسان نہیں ہے کیوں کہ

یہ تو وعدے کا پورا کرنا ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ جب اس کو عیش وخوش حالی میسر ہوتی ہے تو وہ اپنے اہل وعیال اور ان سب لوگوں کو اس میں شریک کرنا چاہتا ہے جو اس کو عزیز اور دل سے پیارے ہیں ان کے بغیر سارا مزہ تلخ اور تمام عیش بے لطف معلوم ہوتا ہے۔ اس مالک حقیقی اور ارحم الراحمین کو مومنین کی اتنی ناگواری بھی گوارا نہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ	اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی

پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے پاس پہنچا دیں گے۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل اولاد پر ان کے آباء کے عمل کی برکت سے ہوگا۔ یعنی بزرگوں کے عمل کی برکت کا ثمرہ اولاد کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مگر خیال رہے کہ اولاد کی دعا کی برکت ان کے آباء یعنی بزرگوں پر بھی فضل مولیٰ ہوتا ہے جس کے متعلق ہمارے

امام سیدنا احمد بن حنبلؒ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نیک بندی کا جنت میں درجہ بلند فرمائے گا تو وہ بندہ کہے گا کہ پروردگار یہ درجہ مجھے کیسے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تمہارے لڑکے نے تمہاری مغفرت طلب کی اور اس کی بدولت تمہیں یہ درجہ عطا کیا گیا۔ اس کی تائید صحیح مسلم شریف کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية۔ أو علم ينتفع به۔ أو ولد صالح يدعو له یعنی آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہوجاتا ہے مگر تین چیزیں باقی رہتی ہیں۔ ایک صدقہ جاریہ جیسے مسجد۔ سرائے یا علوم دینیہ کا مدرسہ وغیرہ۔ دوسرے وہ علم جس سے لوگوں کو نفع حاصل ہو۔ تیسرے نیک لڑکا جو اس کے لئے خدا سے دعا کرے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مومن کی ذریت کو بھی بلند مرتبہ عطا فرماکر اس مومن کے درجے میں پہنچادے گا اگرچہ اس ذریت کے عمل اپنے بزرگوں سے

کمتر ہوں تاکہ ان کے سبب سے اس مومن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں
حافظ ابن جریر لکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالی مومن کی ذریت کو بھی
اگرچہ ان کے عمل کمتر ہوں جنت میں اس مومن کے ساتھ اسی کے درجے
میں رکھے گا تاکہ اس کے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو اور
بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کے چھوٹے بچوں کو اللہ تعالی ان تک
پہنچا دے گا اور ان کے آباء کے ثواب کو کم نہ کرے گا[1]

مذکورہ بالا روایات اور اقوالِ مفسرین کا ماحصل یہی ہے کہ
جنت میں مومنین کی ذریات بھی بلا لحاظ عمل انہیں کے ساتھ ہوگی
بشرطیکہ وہ خود بھی دولت ایمان سے بہرہ ور ہوں۔ اب ذریت کے
لفظی معنی اور اس کے مفہوم کا تعین ضروری ہے کہ اس میں کون کون
شامل ہیں۔

ذریت کے معنی اور اس کے اقسام

علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ الذریۃ اصلھا

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۱۵۔

الصغار من الاولاد وان کان قد یقع علی الصغار والکبار معاً یعنی ذریت اگرچہ اصل میں چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں مگر کبھی چھوٹے بڑے سب پر اس کا اطلاق ایک ساتھ ہوتا ہے۔ خطیب اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہاں ذریت کا مفہوم آباء و ابناء دونوں پر صادق آتا ہے۔ اور جب کسی مومن کا عمل زیادہ ہو تو اس سے کم عمل والے مومن کو بھی اسی درجے میں پہنچا دیا جائے گا خواہ وہ بیٹا ہو یا باپ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا یہی مطلب ہے۔

علامہ خطیب نے ذریت کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ذریت[1] نسب ذریت[2] سبب یعنی محبت۔ اور کہتے ہیں کہ اگر اس کے ساتھ کوئی علم یا کوئی عمل بھی حاصل کرلے تو یہ ذریت کہلانے کا زیادہ مستحق ہے اور اس کو ذریت[3] افادہ کہیں گے اور یہ ذریت محبت ایسی ہے جیسے ذریت ولادت ہوتی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں المرء مع من احبہ الحدیث

فقیر کہتا ہے کہ علم یا عمل حاصل کرنے کی بنا پر جس طرح شاگرد استاد کے ساتھ ذریت میں داخل ہیں اسی طرح اہل بیعت و سلاسل

اپنے شیوخ طریقت کی ذریت میں داخل ہیں کیوں کہ یہ بھی اپنے شیوخ سے معرفت و تزکیہ نفس کے عمل کا استفادہ کرتے ہیں۔ اور شجرہائے طریقت پڑھنے کا طریقہ جو سلف صالحین سے چلا آرہا ہے اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اپنے شیوخ طریقت کی یاد اور ان کی محبت کو تازہ کیا جائے جن کی معیت کا شرف اُس عالم آخرت میں نصیب ہوگا جن کی خاطر سے اللہ تبارک و تعالیٰ آخرت میں انہیں ان مدارج پر ترقی دے گا۔ جو لوگ توسل کو ناجائز قرار دیتے یا شفاعت کا انکار کرتے ہیں وہ اس آیت اور ان روایات کو غور سے پڑھیں۔

جو لوگ خدا کے فضل و کرم پر نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنے عمل ہی پر مدارج اخروی کو منحصر سمجھتے اور لیس للانسان الا ما سعیٰ کی رکیک تاویلیں کیا کرتے ہیں ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے فرماتا ہے

وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ

یعنی ذریت کو اس درجے پر جو ترقی دی جائے گی وہ کوئی مول تول نہیں ہے کہ ان کے بزرگوں کے عمل کو کم کرکے ان کی

ذریت کو ترقی دی گئی اور بزرگوں کے عمل سے کچھ کاٹ کسر یا
کمی کر دی گئی ایسا نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے دنیا
میں ان کو ایمان وعمل کی توفیق بخشی اور آخرت میں ان کو قبولیت کا
شرف عطا فرمایا اور ان کو جنت کے مدارج عالیہ سے سرفراز فرمایا۔
ان کی مسرت کی تکمیل کے لئے ان کے عزیزوں اور ان کے پیاروں
کو بھی ان کے پاس پہنچا دیا یہ سب جو کچھ ہوا محض فضل کی بنا پر ہوا۔
اب عدل کو بیان فرماتا ہے :

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ

ہر شخص اپنے عمل کا پابند ہے۔ اس سے ایک غلط فہمی کا ازالہ ہوتا ہے
کہ جس طرح ایک شخص کے نیک عمل کا اثر دوسرے پر پڑتا تھا اسی طرح
ایک کی برائی کا اثر بھی دوسرے پر پڑنے کا احتمال ہے تو اس شبہ
کے دور کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔
جس کی برائی اس کے ساتھ۔ اگر اس برائی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ
کوئی حصہ نہیں لیا تو وہ ہر طرح اس کی برائی سے بری الذمہ ہے۔
اوپر مقام فضل کا بیان تھا اور یہ مقام عدل کا بیان ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ "رھین" یہاں فعیل ہے بمعنی فاعل جس کا مطلب یہ ہوا کہ "کل امرئ راھن ای دائم" یعنی اگر کسی نے نیکی کی ہے تو وہ ہمیشہ جنت میں رہے گا اور اگر برائی کی ہے تو ہمیشہ آگ میں رہے گا اس لئے کہ دنیا میں اعمال کا دوام اعیان کے دوام کے ساتھ ہے کیوں کہ عرض بغیر جوہر کے باقی نہیں رہ سکتا اور جوہر ہی میں پایا جاتا ہے اور آخرت میں دوام اعیان دوام اعمال کے سبب سے ہے لہذا اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو باقی رکھے گا کیوں کہ یہ عمل اللہ کے پاس باقیات الصالحات کے منجملہ ہیں۔ وما عند اللہ باقٍ والباقی یبقیٰ مع محلہ۔ جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی ہے یعنی غیر فانی ہے اور باقی اپنے محل کے ساتھ باقی رہتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اعیان دنیا جوہر اور عمل عرض ہے جو اس دنیا کے ساتھ قائم ہے اس لئے ہر ذی شعور زندگی بھر مکلف بہ عمل ہے۔ بخلاف آخرت کے۔ اور وہ عالم عمل کے ساتھ قائم ہے یعنی وہاں عمل جوہر اور عالم عرض ہے اور عمل چوں کہ ہمیشہ باقی رہے گا اس لئے وہ عالم بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

فقیر کے خیال ناقص میں اس دنیا کی ناپائداری اور عالم آخرت کے ابدی ہونے کا سبب یہ ہے کہ حیات دنیوی کا اصلی مقصد عمل ہے جیسے اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۔ اور چوں کہ انسان کی صلاحیتیں محدود اور ظرفِ عمل یعنی زمان و مکان چونکہ محدود ہیں اس لئے یہ دنیا بھی ناپائدار ہے اور عالم آخرت چوں کہ جزائے عمل کے لئے ہے اور جزا کا تعلق خدا کی ذات سے ہے جو لم یزل اور لایزال ہے اس لئے عالمِ آخرت بھی غیر منقطع اور لازوال ہے اس لئے اہل جنت کی نعمتیں بھی غیر منقطع ہوں گی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ	ہم ان کو پے در پے میوے دیتے رہیں گے میوؤں کو خاص طور پر اس لئے بیان

فرمایا کہ یہ اس دنیا کی مشہور نعمت ہے اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرماتا ہے :

وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ	اور ہم ان کو ان کے حسب خواہش گوشت بھی دیں گے ۔

اوپر کے بیان سے عمل کی اہمیت ظاہر ہو چکی اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ عموماً محرکات عمل کیا ہوا کرتے ہیں۔ اگر انسانی افعال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اکثر کام یا تو حصول لذت کے لئے ہوتے ہیں یا دفع الم کے لئے۔ لذت کے معنی "ادراک الملائم من حیث انہ ملائم" اور الم کے معنی ہیں "ادراک المنافر من حیث انہ منافر" اور لذت و الم کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) لذتِ حسی جیسے مٹھائی۔ میوہ وغیرہ سے حسِ ذائقہ کو اور کسی خوب صورت چیز کو دیکھنے سے حس باصرہ کو اور اچھی آواز سننے سے حس سامعہ کو یا کسی پُر لطف واقعہ یا کسی دوست کی یاد سے حسِ واہمہ کو لذت حاصل ہوتی ہے اور ان کی ضد الم حسی ہے۔

(۲) لذت عقلی۔ جیسے کسی علمی مسئلہ کے حل سے ایک عالم کو یا شطرنج کی بازی سے کسی شاطر کو یا شہرت و ناموری حاصل کرنے کی دھن میں بعض لوگ بڑی بڑی سختیاں جھیلتے اور تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ یہ اور اسی قبیل کی چیزیں لذات عقلی کہلاتی ہیں۔ اور ان کی ضد آلام عقلی ہیں۔

(۳) لذت روحانی جس کا اثر خاص روح پر بلا واسطہ پڑتا ہے۔ اور اس کی ضد الم روحانی ہے۔

لذت والم کی یہی تین قسمیں ہیں جو عموماً محرکاتِ عمل ہوتی ہیں اسی لحاظ سے نعماتِ جنت کی بھی تین قسمیں ہیں کیوں کہ اہل جنت کے مراتب بھی مختلف ہیں۔ ان میں سے جو جس لذت کو طلب کرے گا خواہ وہ حسی ہو یا عقلی ہو یا روحانی' اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرمائے گا کیوں کہ جس خدا نے اس دنیا میں ان چیزوں کو پیدا کیا ہے وہ آخرت میں بھی ان کو پیدا کر دے گا۔ اس لحاظ سے یہ فرمایا کہ ان کی حسب خواہش گوشت بھی ان کو دیں گے۔ کیوں کہ اوپر سے انہیں لذاتِ حسی کا بیان چلا آرہا ہے مگر یہاں ان کو بیان کر دینے سے لذات عقلی اور لذات روحانی کی نفی نہیں ہو جاتی۔ اور یہ لذاتِ حسی بھی دنیوی لذات کے لحاظ سے صرف لفظی اشتراک رکھتی ہیں معنی اور حقیقت کے اعتبار سے بالکل الگ اور جدا ہیں۔ ان کا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہو گا جب اللہ اپنے فضل و کرم سے ان سے بہرہ ور فرمائے۔

ایک ایسا دیہاتی فرض کیجیے جس نے سوا گڑ کے اور کوئی میٹھی چیز ہی

نہیں کھائی تو وہ برفی اور قلاقند کی لذت کیا جانے۔ آپ محض الفاظ اور
بیان سے ان دونوں چیزوں کا ذائقہ کس طرح اس کو سمجھا سکیں گے جب
اس دنیا کی یہ ادنیٰ ترین چیزیں بغیر چکھے سمجھ میں نہیں آسکتیں تو اُس
عالم کی نعمتوں کا صحیح اندازہ آپ کس طرح کریں گے اسی سبب سے شارع
علیہ السلام نے ان کے متعلق فرمایا کہ نہ کسی آنکھ نے ان کو دیکھا نہ کسی
کان نے ان کو سنا اور نہ کسی کے دل ہی پر اس کا خطرہ گذرا۔ دینے والے
کی قدرت لامحدود ہے" وما کان عطاء ربك محظورا" لینے والے
کے حوصلے اور طلب کے لحاظ سے نعمتیں بھی سرفراز ہوں گی۔

نعمات جنت کے اجمالی ذکر کے بعد اہل جنت کی حالت بیان
فرماتا ہے کہ

يَتَنَازَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ

یعنی اہل جنت کے سامنے جب
شراب طہور کے بھرے ہوئے
جام پیش ہوں گے تو وہ ان کے
لینے کے لئے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کریں گے۔ ان کی یہ کش مکش
نفسانیت یا خودغرضی کی نہ ہوگی بلکہ ایسی خوش مزاجی کے طور پر ہوگی

جیسے عقد خوانی کی محفل میں مصری بادام پھینکے جاتے ہیں تو مہذب لوگ بھی ان کے حاصل کرنے کے لئے آپس میں چھینا جھپٹی کرتے ہیں خیال رہے کہ اس شراب جنت کے دو وصف خاص بیان فرمائے ہیں کہ اس کو پی کر کوئی نہ بیہودہ بکواس کرے گا اور نہ پینے والے سے گناہ سرزد ہوں گے۔ یعنی اس کے اثر سے نہ عقل زائل ہوگی نہ اس میں گندگی ہوگی اور نہ بدبو ہوگی۔ بلکہ اس کا اثر صرف نشاط روح ہوگا۔ اس کے بعد اہل جنت کے خدم وحشم کو بیان فرماتا ہے۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ

جنتیوں کی خدمت کے لئے خوب صورت لڑکے چلتے پھرتے ہوں گے جن کے حسن کو دیکھ کر یہ معلوم ہوگا گویا وہ "درِ مکنون" یعنی صدف کے اندر کے چھپے ہوئے موتی ہیں۔

قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی "یارسول اللہ ھذا الخادم فکیف المخدوم قال والذی نفس محمد بیدہ ان فضل المخدوم

علی الخادم کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب"۔
یعنی یارسول اللہ جب خادم ایسا ہے تو مخدوم کیسا ہوگا؟ حضور اکرم نے
فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان
ہے مخدوم کی فضیلت خادم پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے
چاند کی باقی اور کواکب پر۔

اہل جنت کی شان و شوکت اور خوش حالی۔ عیش و مسرت
کے بیان فرمانے کے بعد ان کی مجلسی حالت اور باہمی گفتگو کا بیان
ہے کہ

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ	وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر

آپس میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ حافظ ابن کثیر اس کی
تفسیر میں لکھتے ہیں "ای اقبلوا یتحادثون ویتساءلون
عن اعمالھم واحوالھم فی الدنیا وھذا کما یتحدث
اھل الشراب علی شرابھم اذا اخذ فیھم الشراب
بما کان من امرھم۔" اور قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ "یتساءلون

بعضهم بعضاً عن احواله واعماله" یعنی اہل جنت کے آگے جب شراب طہور کے جام پیش ہوں گے تو وہ اثناء دور میں ایک دوسرے سے ان کے دنیوی حالات و اعمال کی نسبت دریافت کریں گے۔ اس کے جواب میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ

قَالُوٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ "ای کنا فی الدار الدنیا ونحن بین اهلنا خائفین من ربنا ومشفقین من عذابه وعقابه فمن الله علینا ووقنا عذاب السموم فتصدق علینا واجارنا مما نخاف۔ انا کنا من قبل ندعوه ای نتضرع الیه فاستجاب لنا واعطانا سوالنا انه هو البر الرحیم"۔

حاصل یہ کہ ہم دنیا میں اپنے اہل وعیال کے درمیان خدا کے عذاب و عقاب سے ڈرتے تھے۔ اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچایا۔ ہم جس چیز سے ڈر رہے تھے خدا نے ہمیں اس سے پناہ دی۔ ہم پہلے بھی خدا سے دعائیں کرتے اور اس کے آگے گریہ و زاری کرتے اور گڑگڑاتے تھے۔ اللہ نے ہماری دعا قبول کر لی اور

ہماری منہ مانگی مراد ہم کو دی وہ بڑا محسن اور بڑا مہربان ہے۔

بیضاوی لکھتے ہیں کہ "خائفین من عصیان اللہ ومشفقین لطاعتہ او وجلین من العاقبۃ (فمن اللہ علینا) بالرحمۃ والتوفیق (ووقنا عذاب السموم عذاب النار النافذۃ فی المسام نفوذ السموم (انا کنا من قبل) ذلک فی الدنیا۔

اگرچہ یہاں حافظ ابن کثیر اور قاضی بیضاوی صرف دو مفسرین کی عبارتیں منقول ہیں مگر اس سلسلہ میں میری محدود نظر سے جتنی بھی تفاسیر گذریں سب کا اسی پر اتفاق ہے کہ یہ باہمی سوال و جواب اعمال دنیوی کی نسبت ہوگا یعنی ایک دوسرے سے یہ پوچھیں گے کہ تم کو یہ مرتبہ کس طرح ملا تو جواب میں ہر ایک جنتی دوسرے سے یہی کہے گا کہ میں جب دنیا میں تھا تو اپنے اہل و عیال یعنی بال بچوں میں بیٹھے ہوئے خدا کے عذاب سے ڈرا کرتا تھا جس کی بدولت آج خدائے تعالیٰ نے مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ اور یہ اس کا کرم اور احسان ہے۔ مگر اس آیت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ایک دوسرے سے کیا سوال کریں گے البتہ جواب کی صراحت ہے کہ

انا کنا قبل فی اھلنا مشفقین۔ یقیناً خدا کا خوف اساسِ تقویٰ ہے مگر اس کے ساتھ "فی اھلنا مشفقین" کی قید و تخصیص کیا معنی رکھتی ہے۔ مذکورہ بالا تفسیر سے اس کی تشفی پوری طرح نہیں ہوتی۔

فقیر کے خیال ناقص میں یہ دونوں آیتیں بالکلیہ اوپر کی آیتوں سے متعلق ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ اہل جنت جب جنت میں پہنچ جائیں گے اور وہاں اپنے اہل و عیال کو نہ دیکھیں گے تو ان کو تشویش ہوگی تو خدائے تعالیٰ ان کی خاطر سے ان کے اہل و عیال کو بھی ان تک پہنچا دے گا اور جب یہ لوگ وہاں پہنچ جائیں گے تو ان نووارد جنتیوں کے متعلق وہ جنتی جو پہلے سے وہاں موجود ہوں گے ایک دوسرے سے سوال کریں گے کہ یہ کون لوگ ہیں جو یکایک آگئے۔ اس کے جواب میں ایک دوسرے سے کہیں گے کہ یہ ہمارے اہل و عیال اور یہ ہمارے پیارے ہیں۔ ہم نے ان کو یہاں نہ دیکھا تو تشویش ہوئی کہ مبادا یہ کسی عذاب میں نہ مبتلا ہو گئے ہوں تو خدا نے ہماری خاطر سے ان کو ہم تک پہنچا دیا اور ہم سب پر بڑا احسان فرمایا وہ بڑا محسن اور بڑا مہربان ہے واللہ اعلم بالصواب۔

هذا ما ظهر لی ان کان صحیحاً فنحمدہ ونشکرہ وان کان من تلقاء نفسی فنعوذ بہ ونستغفرہ۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ خدا نے ہم سب پر احسان کیا کہ اُس دنیا میں بھی ہم کو نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی اور اس عالم میں بھی اپنی رحمت اور فضل و کرم سے ہم کو اور ہماری خاطر ہمارے اہل و عیال اور ہماری ذریت کو بھی ان مدارج اور نعمتوں سے سرفراز فرمایا "عذاب السموم" کی تفسیر میں قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ "عذاب النار النافذۃ فی المسام نفوذ السموم" یعنی اس سے مراد آگ کا وہ عذاب ہے جو گرم ہوا کی طرح جسم کے مسامات کے اندر تک نافذ ہو جائے گا۔ اللھمّ احفظنا منہ۔

اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ یعنی ہم دنیا میں اسی کی دعائیں مانگا کرتے تھے آج خدا کے فضل و کرم سے ہماری دعاؤں کی قبولیت ہمارے سامنے ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وعدہ فرمایا تھا کہ ادعونی استجب لکم آج اس کا

یہ وعدہ پورا ہوا اور ہم کو ہماری منہ مانگی مرادیں ملیں۔

إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ | بے شک وہ محسن اور بڑا مہربان ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۞ 52- 29
أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ۞ قُلْ تَرَبَّصُوا 52- 30 52- 31
فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِينَ ۞ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُمْ بِهَٰذَا 52-32
أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ۞ أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ۞ 52-33 52-34
فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ۞ أَمْ خُلِقُوا 52- 35
مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۞

بس آپ (اے محمدؐ) نصیحت کیجے بس آپ (اے محمدؐ) اپنے پروردگار کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں نہ دیوانے۔ کیا وہ (کافر آپ کے متعلق) کہتے ہیں کہ (محمدؐ) شاعر ہے۔ ہم ان کے حق میں حوادث زمانہ کا انتظار کرتے ہیں (اے رسول) آپ (بھی) ان سے کہہ دیجے کہ تم (بھی) انتظار کرو۔ اور میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ کیا ان کی عقلیں ان کو یہی حکم دیتی ہیں یا یہ سرکش لوگ ہیں

کیا وہ (کافر) یہ کہتے ہیں کہ (قرآن) ان کی بنائی ہوئی بات ہے بلکہ
وہ (اس پر) ایمان نہیں لاتے (آپ ان سے کہہ دیجے کہ) اگر وہ
سچے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ (بھی) اس کے جیسی ایک بات بنالائیں
کیا یہ (منکرین) بغیر کسی چیز (یعنی پیدا کرنے والے) کے (از خود)
پیدا ہو گئے ہیں۔ یا یہ خود ہی پیدا کرنے والے ہیں۔

کفار قریش کی چار گستاخیاں

کفار قریش عموماً آپؐ کی شان میں گستاخی سے اکثر یہی چار باتیں کہا کرتے تھے :۔

(۱) آپ کاہن ہیں

(۲) آپ دیوانہ ہیں

(۳) آپ شاعر ہیں

(۴) آپ ساحر ہیں (معاذاللہ)

ان الفاظ کی خصوصیت فقیر کے خیال میں یہ ہے کہ

پہلی گستاخی کی حقیقت

منکرین جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے

قرآن حکیم کو سننے جس میں گذری ہوئی امتوں کے واقعاتِ عبرت خیز اور غیب کی خبروں کا بیان ہے تو آپ کو کاہن کہتے کیوں کہ کاہن اس شخص کو کہتے ہیں جو گذری ہوئی خبریں بیان کرے جیسے عَرّاف اس شخص کو کہتے ہیں جو آئندہ واقعات کو بیان کرے۔ چنانچہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ الکاھن الذی یخبر بالاخبار الماضیہ بضرب من الظن کالعراف الذی یخبر بالاخبار المستقبلۃ علی نحو ذلک ولکون ھاتین الصناعتین مبنیتین علی الظن الذی یخطی ویصیب[1] قال علیہ السلام من اتی عرافاً او کاھناً فصدقہ بما یقول فقد کفر بما انزل اللہ علی ابی القاسم یعنی کاہن اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک خاص قسم کے گمان سے گذری ہوئی باتوں کی خبر دیتا ہے جیسے عرّاف اس شخص کو کہتے ہیں جو اسی طرح آئندہ کی خبریں دیتا ہے چوں کہ ان دونوں صنعتوں کا دار و مدار محض گمان پر ہوتا ہے جو کبھی غلط اور کبھی درست ہوتا ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی عرّاف یا کاہن کے پاس گیا اور اس کی بات کی تصدیق کی تو اس نے وحی خداوندی کا انکار کیا جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے

[1] (الکاھن) ھو الذی یخبر من الکوائن فی مستقبل الزمان ویدعی معرفۃ الاسرار

رسول ابوالقاسم (محمدؐ) پر نازل فرمائی ہے۔

دُوسری گُستاخی کی حقیقت

منکرین قریش آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ دیوانہ کہتے تو اس کی وجہ نہ تھی کہ ان کو معاذ اللہ آپ کے اقوال یا افعال میں کسی قسم کی بے ربطی و بدنظمی دکھائی دیتی تھی بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ دنیا و مافیہا کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے ہر وقت فکر عقبیٰ کی طرف متوجہ اور دوسروں کو بھی ہمیشہ اسی کی طرف توجہ دلاتے تھے اور یہی چیز منکرین کی سمجھ سے باہر تھی ورنہ بعثت سے پہلے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں نہایت ہر دل عزیز تھے مگر آپ کی بعثت اور دعوت نبوت کے بعد جن لوگوں نے آپ کی سب سے پہلے دعوت قبول کی۔ راہ حق پر چلے اور آپ کے فیض صحبت یا زیارت سے مشرف ہوئے وہ صحابۂ کرامؓ کہلاتے ہیں اور جن لوگوں نے آپ کی دعوت قبول نہ کی اور ضد و عناد سے حق کا انکار کیا وہ کفار قریش ہیں۔ اور بناء مخالفت یہی دعویٰ نبوت ہے۔ آپ کو اس تبلیغ حق سے باز رکھنے کے لئے کفار قریش قسم قسم کی تدبیریں کرتے تھے۔

کبھی دھمکیوں سے کام لیتے جب ان سے کام نہ چلتا تو آپ کو دعویٰ نبوت سے باز رکھنے کے لئے قسم قسم کی ترغیبیں دیتے مگر جب یہ دیکھتے کہ نہ تو آپ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ دنیوی شان وشوکت کی ہی پرواہ کرتے ہیں نہ مال و دولت کو خاطر میں لاتے ہیں اور نہ جاہ و منصب کی آپ کے پاس کوئی قدر و قیمت ہے تو وہ آپ کو (معاذ اللہ) دیوانہ کہتے تھے۔ کیوں کہ ان کے خیال خام میں یہ چیزیں اتنی اہم تھیں کہ کوئی سمجھدار اور صاحب عقل و دانش ان کو رد نہیں کرسکتا۔

تیسری گستاخی کی حقیقت

منکرین قریش جب قرآن حکیم کی کمال فصاحت و بلاغت کو دیکھتے اور اہل زبان ہونے کی وجہ سے اس کی اعجاز بیانی کا انکار نہ کرسکتے اور اس کی مماثلت سے اپنے فصحاء و بلغاء کو عاجز پاتے تو آپ کو "شاعر" کہتے تھے کیوں کہ ان کی خام خیالی اس سے آگے کسی مرتبہ کا ادراک نہ کرسکتی تھی۔

چوتھی گستاخی کی حقیقت

جب صحابہ کرامؓ کی وارفتگی اور خدا و رسولؐ کی والہانہ

محبت اور جوش ایمان پر نظر کرتے تو ان کو خیال ہوتا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جادو کر دیا ہے اور ان لوگوں کی یہ ازخود رفتگی اسی سحر کا اثر ہے۔ اور اس کے ساتھ آپ کے معجزات اور تصرف فی الکائنات کو دیکھتے تو اس کو بھی جادو ہی سے تعبیر کرتے۔ حاصل یہ کہ ان کوتاہ اندیشوں کو خدا کی قدرت کا یقین نہ آتا تو ان سب کو وہ سحر اور جادو کہہ کر وہ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ان آیات مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے حبیب کریم کی طرف سے ان کی ان گستاخیوں کا جواب دیتا ہے کہ

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝

آپ نصیحت کیجے بس آپ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں نہ دیوانہ۔ اس کی تفسیر میں شیخ اسمٰعیل حقیؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کی طرف سے نیابۃً کفار کی تردید فرماتا ہے کیوں کہ آپ کو تذکیر کا حکم دیا گیا ہے جس کا تعلق وحی سے ہے جس کا اقتضاء کمال عقل و کمال صداقت ہے

جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ نہ تو کاہن ہیں نہ دیوانہ[1] ۔ انتہی کیوں کہ بہ لحاظ مخاطب نبیؐ کے فرایض اصولاً دو ہیں ۔ منکرین کو دعوت و تبلیغ اور مومنین کو تذکیر و تعلیم ۔ اگر منکرین سرکشی سے پیغام حق کو قبول نہیں کرتے تو دعوت کے بعد نبیؐ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اب آپ مومنین و متبعین کی طرف توجہ فرمائیے اور ان کو پند و موعظت فرمائیے ۔ اور مدارج روحانی کی ترقی کی تعلیم دیجیے ۔

اس کے ساتھ اپنے حبیبؐ پاک کو تسلی دیتا اور خود رب العزت ان کی رسالت کی تصدیق فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے فضل و کرم سے آپ کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپ کے سر پر ختم نبوت کا تاج رکھا ۔ اور سیادت مرسلین کی عزت بخشی ۔ اپنی رحمت کاملہ سے اتنی بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا ۔ اگر یہ سرکش اس کو نہیں جانتے تو یہ ان کی کج فہمی اور بدنصیبی ہے ۔ بس آپ کا کام نصیحت کرنا اور ہدایت کرنا ہے ۔ اس کے بعد ان کی تیسری گستاخی کے جواب میں کمال بلاغت سے بطور استفہام فرماتا ہے کہ

---

[1] تفسیر روح البیان ۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيۡبَ الۡمَنُوۡنِ	کیا وہ کافر آپ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ شاعر ہیں ہم ان کے حق میں حوادث زمانہ کا انتظار کرتے ہیں۔

اس آیت کی شان نزول میں حافظ ابن جریرؒ[1] لکھتے ہیں کہ

شان نزول مجاہدؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قریش نے دارالشوریٰ میں جمع ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق باہم مشورہ کیا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ ان کو باندھ کر قید کردو اور حوادث زمانہ کا انتظار کرو یہاں تک کہ وہ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلاک ہوجائیں جیسے ان سے پہلے شعراء زہیر۔ نابغہ وغیرہ ہلاک ہوچکے ہیں یہ بھی انہیں کے جیسے ایک شاعر ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یعنی ان منکرین کی دریدہ دہنی کیا اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ آپ کو شاعر کہتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری شاعروں کی طرح آپ بھی ایک روز ہلاک ہوجائیں گے اور اسی کے

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۱۹۔

ساتھ یہ پیغام حق بھی محض ایک افسانہ اور روایت ہو کر رہ جائے گا
اس کو اور آئندہ باتوں کو استفہامی انداز میں بیان فرمانے کی حکمت
بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جملۂ خبریہ سے جملۂ انشائیہ زیادہ موثر ہوتا ہے
کیوں کہ جس کے ضمیر میں کچھ بھی جان ہو اگر وہ ان امور پر غور کرے تو
ان باتوں کی حقیقت اس کے آگے روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔
واللہ اعلم و علمہ اتم۔

ان کی اس خام خیالی کے جواب میں اپنے حبیبؐ پاک سے فرماتا
ہے کہ

قُلْ تَرَبَّصُوا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ	آپ بھی ان سے کہہ دیجے کہ

اچھی بات ہے تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار
کرتا ہوں کہ آیا یہ کلام الٰہی جو مجھ پر نازل ہو رہا ہے محض ایک شعر
اور یہ قرآن حکیم محض ایک روایت تفریحی اور یہ دین حق محض ایک
قصۂ ماضی ہو کر رہ جاتا ہے یا باطل نیست و نابود۔ اور حق چار دانگ
عالم میں پھولتا پھلتا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ کوئی اپنے نبیؐ کی

ہلاکت کا متوقع نہیں ہوا مگر خود ہلاک ہوگیا۔

آج یعنی ۱۳۷۲ھ کا زمانہ آپ کے سامنے ہے دیکھئے اس قرآن حکیم کے کروڑوں ماننے والے سارے عالم میں موجود ہیں جن کی مسجد وں اور گھروں سے اسی قرآن حکیم کی آواز گونجتی ہے اور منکرین قریش مٹ گئے ان کے انتظار کا زمانہ بھی گذر گیا فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس کے بعد کمال بلاغت سے دریافت فرماتا ہے کہ

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ	کیا ان کی عقلیں ان کو یہی حکم دیتی ہیں۔ یا یہ سرکش لوگ ہیں

دین حق ان کے سامنے آفتاب سے زیادہ روشن ہے اور آپؐ کی پاک سیرت ان کے سامنے موجود ہے مگر وہ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ ان کی عقلوں پر پتھر پڑ گئے ہیں یا محض سرکشی اور عناد کی وجہ سے وہ ایسی بیہودہ باتیں کرتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ کوئی چیز یا تو سمع سے ثابت ہوتی ہے یا یا عقل سے ثابت ہوتی ہے اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشاد کا

مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کے پاس ایا کوئی امر سمعی وارد ہوا ہے
یا ان کی عقلیں ماری گئیں ہیں جو ان کو ایسا حکم دیتی ہیں یا یہ سرکش
لوگ ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں اور طغیان کے معنی نافرمانی میں
حد سے گزر جانے کے ہیں۔

اس کے بعد اپنے حبیب پاک سے دریافت فرماتا ہے کہ

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ	کیا وہ کافر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان کی یعنی

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی ایک بات ہے۔ تعجب ہے کہ
باوجود اہل زبان ہونے کے وہ ایسی مہمل بات کہتے ہیں کہ یہ خدا کا
کلام نہیں ہے بلکہ آپ کی بنائی ہوئی بات ہے۔ اور اگر وہ اس پر
ایمان نہیں لاتے تو آپ بھی ان کو دعوت مقابلہ دے دیجئے کہ

فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ؕ	یعنی منکرین اگر اپنے اس دعوی میں

سچے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ اپنے دعوی کے ثبوت میں وہ بھی ایسا ہی کلام
پیش کریں یعنی ہمارے حبیب و رسول سے ہمارا کلام سن کر اس کی

فصاحت و بلاغت و اعجاز بیانی کا انکار نہیں کر سکتے تو تم یہ کہہ دیتے ہو کہ محمدؐ شاعر یا کاہن ہیں اور یہ کتاب وحی الٰہی نہیں بلکہ ان کی تصنیف ہے اگر تم سچے ہو تو تمہارے پاس فصیح و بلیغ شعراء بھی موجود ہیں۔ جادو بیان خطباء بھی موجود ہیں پھر ان کی مدد سے تم بھی اس کی مثل بنا کر لاؤ کیوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک اُمّی ہیں جب ایسی کتاب تصنیف کر سکتے ہیں تو دوسرے انسان بھی اس کے جواب میں ایسی کتاب لکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد منکرین کی حالت کے متعلق فرماتا ہے کہ

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ	کیا یہ بغیر کسی چیز یعنی یہ منکرین کسی پیدا کرنے والے کے بغیر خود بخود پیدا ہو گئے یا یہ خود ہی

پیدا کرنے والے ہیں۔ اس کی تفسیر میں حافظ ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ کیا یہ منکرین بغیر ماں باپ کے پیدا ہو گئے اور ان کی حالت جمادات کی سی ہے کہ نہ تو ان میں عقل ہے اور نہ سمجھ۔ نہ تو ان کے پاس کوئی حجت ہے اور نہ وہ کسی عبرت ہی سے کام لیتے ہیں اور نہ

ان پر کسی نصیحت ہی کا اثر ہوتا ہے۔ یعنی ان منکرین کی قساوت قلبی
اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان پر کسی سچی اور اچھی بات کا اثر نہیں ہوتا
حالاں کہ اگر وہ خود اپنے وجود پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ خود بخود
نہیں پیدا ہوگئے بلکہ ان کا بھی کوئی خالق ہے جس نے ان کو عدم سے
وجود میں لایا بس وہی خدا حقیقی مالک اور لائق عبادت ہے۔

اس کے بعد منکرین حق کی مجبوری و بے بسی جتانے اور ان کی جہالت
وسفاہت کا یقین دلانے کے لئے فرماتا ہے کہ

أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ ۝ 52- 36
أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ ۝ 52- 37
أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۚ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُم 52- 38
بِسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۝ أَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ۝ أَمْ 52-39
تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ۝ أَمْ عِندَهُمُ 52-40
الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ۝ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ 52-41 52- 42
كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ۝ أَمْ لَهُمْ إِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ 52-43
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝

کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (ایسا نہیں ہے) بلکہ وہ یقین نہیں کرتے۔ کیا ان کے پاس آپ کے پروردگار کے خزانے ہیں۔ کیا یہ (منکرین ان خزانوں کے) داروغہ ہیں۔ کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر (سے آسمانوں کی باتیں) سن لیتے ہیں (اگر بالفرض ایسا ہے) تو ان کے سننے والے کو ایک کھلی ہوئی دلیل پیش کرنا چاہئے۔ کیا اس (خدا) کو بیٹیاں اور تم کو بیٹے ہیں۔ کیا (اے محمدؐ) آپ ان سے (تبلیغ رسالت کی) اجرت طلب کرتے ہیں کہ وہ تاوان (کے بوجھ) سے بوجھل ہیں۔ کیا ان کے پاس کوئی خاص علم غیب ہے کہ وہ (اس کو) لکھ لیتے ہیں۔ کیا وہ مکر کا ارادہ کرتے ہیں۔ پس جو لوگ کافر ہیں وہی مکر کئے گئے (یعنی فریب خوردہ) ہیں۔ کیا خدا کے سوا ان کا کوئی (اور) معبود ہے۔ پاک ہے اللہ اس چیز سے جس کو وہ شریک کرتے ہیں۔

اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ؕ	کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (ایسا نہیں ہے) بلکہ وہ یقین نہیں کرتے

یعنی ان کے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ زمین اور آسمان کے پیدا کرنے والے ہیں اس لئے وہ خدا کے اوامر و نواہی کی تعمیل نہیں کرتے کیوں کہ پیدا کرنے والا ہی حقیقی مالک اور امر و نہی کا مجاز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنے خالق ہیں اور نہ زمین و آسمان کے۔ بلکہ ان کو خدا کے وعدہ اور وعید دونوں کا یقین نہیں آتا اس لئے وہ اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل نہیں کرتے۔[1]

جب وہ اس سے عاجز ہیں تو پھر کیا وہ دولت کے نشہ میں چور ہیں اور اسی کے گھمنڈ میں قبول حق سے انکار کرتے ہیں کیوں کہ دولت اکثر کم ظرفوں کو فسق و فجور عیش و عشرت اور لہو و لعب میں مبتلا کر دیتی ہے اور خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ؕ	اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے والوں کے پاس کیا آپ کے پروردگار کے خزانے ہیں جن کی بدولت وہ

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۷ صفحہ ۲۰۔

خدا کی آیتوں سے مستغنی ہو گئے ہیں یا وہ ان خزانوں پر مسلط یعنی داروغہ ہیں ؟

منکرین کی قدرت اور دولت دونوں کی نفی کرنے کے بعد ان کی سفاہت اور جہالت کے اظہار کے لئے فرماتا ہے

اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ يَّسۡتَمِعُوۡنَ فِيۡهِ‌ۚ فَلۡيَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍؕ	کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ فرشتوں کی باتیں سن لیتے اور ان پر

جو وحی الٰہی بھیجی جاتی ہے اس کو معلوم کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کو علم غیب حاصل ہو جاتا ہے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی خدا کی طرف سے غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ یعنی جب یہ منکرین وحی آسمانی اور کلام ملائکہ سے بے خبر ہیں تو پھر ان کو کیا حق ہے کہ اس وحی کا انکار کریں جو خدا نے اپنے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ اپنے حبیب پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اور جو اس علم غیب سے عاری ہو اس کا کام ایمان و اطاعت ہے نہ کہ تکذیب و نافرمانی۔

اگر ان سرکشوں کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ بھی آسمانی باتوں سے واقف و باخبر ہیں تو ان میں سے جو شخص آسمان کی باتیں سننے کا مدعی ہے اس کو چاہیئے کہ اپنی صداقت کے ثبوت میں ایک واضح اور قوی دلیل پیش کرے جیسے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کی صداقت کے دلائل پیش کرتے ہیں ورنہ بے دلیل دعویٰ ناقابل قبول ہے۔ اس کے بعد منکرین کی دریدہ دہنی اور گستاخی کے جواب میں فرماتا ہے۔

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ	کیا خدا کو بیٹیاں اور تم کو بیٹے ہیں۔

یعنی جب انہوں نے فرشتوں کو نہیں دیکھا اور نہ ان کی باتیں سنیں اور نہ وہ آسمانی حالات سے باخبر ہیں تو پھر ان کو یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ایک طرف تو وہ اپنے لئے بیٹوں پر فخر کرتے اور بیٹیوں کو پسند نہیں کرتے اور لڑکی پیدا ہونے کے بعد ننگ و عار سمجھ کر اس کو زندہ دفن کر دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یعنی جو بات اپنے لئے موجب ننگ و عار

سمجھتے ہیں وہی بات نہایت ڈھٹائی سے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کو نہ تو کوئی بیٹا ہے اور نہ بیٹی وہ لم یلد ولم یولد اور تمام عیوب سے پاک و منزّہ ہے۔

پھر وہ رب العزت اپنے حبیب پاک سے سوالاً فرماتا ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۚ

کیا آپ ان سے مزدوری طلب کرتے ہیں کہ وہ تاوان کے بوجھ سے بوجھل ہیں یعنی کیا یہ منکرین آپ کی دعوت اس لئے قبول نہیں کرتے کہ آپ ان سے تبلیغ رسالت کا کوئی معاوضہ یا ٹکس طلب کرتے ہیں جس کا بار یہ اٹھا نہیں سکتے اس لئے اس ٹکس سے بچنے کے لئے اس دین حق کو قبول کرنے میں ان کو تامل ہے اور اگر ایسا نہیں تو پھر

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۚ

کیا ان کے پاس کوئی خاص علم غیب ہے جس کو وہ لکھ لیتے ہیں اور اسی کے لحاظ سے وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں۔

قتادہ رح کہتے ہیں کہ یہ آیت اوپر والی آیت "نتربص بہ

ریب المنون" کا جواب ہے یعنی کیا ان کو علم غیب سے یہ معلوم ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پہلے اس دنیا سے رحلت کر جائیں گے
اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو پھر

اَمۡ یُرِیۡدُوۡنَ کَیۡدًاؕ | کیا یہ بھی ان کی ایک چال ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ مکاری

کر رہے ہیں۔ اور اگر یہی ہے تو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ

فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا هُمُ الۡمَكِيۡدُوۡنَ | بس جو لوگ کافر ہیں وہی فریب خوردہ ہیں کیوں کہ

ان کی اس مکاری کا اثر خدا اور اس کے رسول پر کچھ بھی نہیں پڑ سکتا بلکہ حقیقت میں وہی کافر و منکر فریب خوردہ ہیں۔

دیکھو ان سرکشوں کا انجام کیا ہوا یہ جنگ بدر میں مارے گئے اور ذلیل و خوار ہوئے۔ اور آخر کار خدا کا دین غالب اور باطل مغلوب ہوا۔ اور وہ دین حق یعنی اسلام آج بھی آفتاب سے زیادہ روشن اور اس کی تصدیق کرنے والے کروڑہا غلامان محمدؐ اس وقت تقریباً تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ربنا اننا سمعنا

منادیاً ینادی للایمان ان اٰمنوا بربکم فاٰمنا ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفرعنا سیاٰتنا وتوفنا مع الابرار۔
اس کے بعد منکرین کی نسبت اپنے حبیبؐ پاک سے دریافت فرماتا ہے:

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ کیا خدا کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے جو ان کی حفاظت کرتا۔ رزق دیتا اور ان کی مدد کرتا ہے اور اسی کے خوف سے یہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے اور ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ اگر وہ اسی خبط میں مبتلا ہیں تو ان کا یہ خیال سراسر غلط ہے۔ اس شرک کا نتیجہ خود ان کے حق میں بہت ہی برا ہوگا۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ابد الآباد کی تباہی میں مبتلا کردیں گے اور خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ پاک ہے اللہ اس چیز سے جس کو وہ شریک کرتے ہیں۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ 52-44

مَرْكُوْمٌ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ 2- 45
يُصْعَقُوْنَ ۙ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا 2- 46
هُمْ يُنْصَرُوْنَ ؕ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ 2- 47
ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ 2-48
رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ 2-21
وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ؑ 2-49

اور وہ (منکرین) اگر آسمان سے ایک ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں تو
کہیں کہ (یہ تو) تہ بر تہ ابر ہے۔ پس آپ ان کو چھوڑ دیجے۔
یہاں تک کہ وہ اپنے اس روز سے ملیں جس میں وہ بے ہوش
کئے جائیں گے جس روز ان کا مکر انہیں کچھ کام نہ دے گا۔ اور
نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔ اور بے شک جن لوگوں نے ظلم کیا
ہے ان کے لئے اس کے سوا (اور بھی) عذاب ہے۔ مگر ان میں
سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور آپ اپنے پروردگار کے حکم کا
انتظار کیجے پس بے شبہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور
جب آپ کھڑے ہوں تو اپنے پروردگار کی پاکی تعریف کے ساتھ

بیان کیجے اور ستاروں کے غایب ہونے کے بعد رات کے کچھ حصہ میں (بھی خدا کی تعریف و تسبیح کیجے)۔

اس خلاق عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے انسان کو جو نعمتیں بخشی ہیں ان میں "دل و دماغ" ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اگر ان میں فساد پیدا ہوجائے تو انسان مرتبۂ انسانیت سے گرجاتا بلکہ بعض حالتوں میں حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے اس لئے قرآن حکیم میں بھی منکرین کے دل و دماغ کی حالتوں کو بار بار مختلف پیرایوں اور مختلف انداز سے فرمایا گیا ہے۔

اوپر کی آیتوں میں منکرین سے جو سوالات کئے گئے ہیں وہ سب ایک صحیح دماغ کو دعوت فکر دیتے ہیں مگر ان کی فکریں غلط راستے پر جاتی ہیں اور ان کو جو سوجھتی ہے الٹی ہی سوجھتی ہے اس لئے بطور تعجب فرمایا کہ کیا ان کی عقلیں ان کو یہی حکم دیتی ہیں گویا اس طرح ان کی فساد ذہنیت کو بیان فرمایا اب اس کے بعد ان کے دل کی حالت بیان فرماتا ہے کہ ان کی قساوت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ :—

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ	اور وہ (منکرین) اگر آسمان سے ایک ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں تو کہیں کہ (یہ تو) تہ برتہ ابر ہے۔ یعنی

ان منکرین کی قساوت قلبی اس حد تک پہنچ گئی ہے اور ان کا احساس ایسا فنا ہو گیا ہے کہ بطور عذاب اگر یہ اسمان کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر گرتا ہوا دیکھیں تو بجائے خدا سے ڈرنے کے وہ یہ کہہ دیں گے کہ یہ تو تہ برتہ ایک ٹکڑا ہے یعنی ایک معمولی بات ہے اس سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔

عقیدے اور عمل کا اثر روح پر پڑتا ہے اور اس کا اندازہ انسان کے قلب کی حالت سے ہوتا ہے ایمان اور عمل صالح کے اثر سے دل میں خدا کا خوف اور نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی لینت قلبی کے سبب سے ایک انسان دوسرے انسان بلکہ دوسری مخلوق پر بھی رحم کرتا ہے اور خوف خدا اس کو دوسروں کی حق تلفی اور ایذا رسانی سے باز رکھتا اور فرائض کی ادائی کا محرک ہوتا ہے۔ وہ خالق اور مخلوق دونوں کے حقوق پہچانتا اور ان کو ادا کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔

اس طرح ایک انسان اپنی دنیا و آخرت دونوں درست رکھتا اور ضمیر کی ملامت سے محفوظ رہتا ہے۔ کفر و عصیاں کا اثر بھی روح و قلب دونوں پر پڑتا ہے یعنی کفر و معصیت سے روح گندہ اور دل سخت ہو جاتا ہے اور آخر کار انسان کا ضمیر فنا ہو جاتا ہے۔ اور ضمیر کی موت کے بعد کوئی ہدایت نفع نہیں دے سکتی۔ اس آیت میں منکرین کی اسی حالت کا بیان ہے کہ ان پر عذاب الٰہی بھی نازل ہو تو وہ کفر و معصیت سے توبہ کرنے کی بجائے فضول اور مہمل باتیں کرنے لگیں گے۔ اور جب ان کی سرکشی اور سنگ دلی اس حد تک پہنچ گئی ہے اور ان میں قبول ہدایت کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی تو اب ان کی اصلاح کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اپنے حبیبؐ پاک سے فرماتا ہے کہ

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِىْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۙ	بس اب آپ ان کو چھوڑ دیجے یہاں تک کہ وہ اپنے اُس روز سے ملیں جس میں وہ

بے ہوش کئے جائیں گے۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے

جنگ بدر کا دن مراد ہے جس میں بڑے بڑے سرکش ابوجہل اور اس
کے ساتھی مارے گئے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد عذاب قبر
ہے یعنی منکرین کو قیامت اور حساب وکتاب سے پہلے جب عالم برزخ
میں عذاب دیا جائے گا تو اس وقت ان پر اس کفر و معصیت کی
حقیقت کھلے گی کہ ان کے عقائد فاسدہ اور اعمال بد کا انجام کیا ہوا اور
اپنی حیات دنیوی کو انہوں نے کس طرح خود اپنے ہی ہاتھوں برباد
کیا۔ مگر اس وقت کی پشیمانی انہیں کچھ کام نہ دے گی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد عذاب قیامت ہے
یعنی منکرین کو انکار و عصیاں کا حقیقی نتیجہ اس وقت معلوم ہوگا جب
وہ قیامت کے دن اپنے عقائد و اعمال کی جواب دہی کرتے ہوں گے۔

یہ تینوں باتیں اگرچہ بظاہر ایک دوسرے سے مختلف معلوم
ہوتی ہیں مگر حقیقتاً ان کے وقوع میں اختلاف نہیں ہے کیوں کہ منکرین
قریش کو جنگ بدر کے دن جس ذلت و خسران کا منہ دیکھنا پڑا وہ ان کے
حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا وہ اپنی دانست میں یہ سمجھے ہوئے تھے
کہ ہم نے اپنی قوت سے اسلام کو دبا دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

آخر کار مکۂ مکرمہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ اب اگر ہم مدینۂ منورہ پہنچ کر (نعوذ باللہ) آپ کا خاتمہ کردیں تو غریب انصار ہمارے مقابلہ میں کیا ٹھیر سکتے ہیں بس ایک ہی حملے میں اسلام کو مٹا کر رکھ دیں گے مگر پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جاسکا اور آخر کار حق سربلند اور باطل ذلیل و خوار ہوا۔

اس کے بعد اس سے بڑی دوسری ذلت جو ان کو اٹھانی پڑی وہ فتح مکہ تھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جرار لشکر کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے۔ منکرین قریش اور ان کے معبودانِ باطل دونوں ذلیل و خوار ہوئے نہ معبودوں نے اپنے عابدوں کی حمایت و مدد کی اور نہ ان کی عبادت کرنے والے اپنے معبودوں کی حفاظت کر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ سارے بت خانۂ کعبہ سے نیچے گرا دئے گئے اور ہر ہر بت اپنے پرستش کرنے والوں کے سامنے اوندھا پڑا ہوا گویا اپنی زبان حال سے اپنی داستان عبرت بیان کر رہا تھا کہ : ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہو

اس طرح مسلسل باطل گرتا اور حق اونچا ہوتا گیا۔ جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ مگر جنگ بدر کی فتح اور فتح مکہ ہی پر یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا بلکہ عذاب قبر اور عذاب قیامت بھی اس کے علاوہ ہیں۔ اس کے بعد اس دن کی مزید صراحت فرماتا ہے کہ ان منکرین کو جس روز موعود کے لئے ڈھیل دی جا رہی ہے وہ روز کیسا ہو گا۔

يَوْمَ لَا يُغْنِىْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ	جس روز ان کا مکر انہیں کچھ کام نہ دے گا اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے وہ مقررہ دن

ایسا ہو گا کہ اس روز ان منکرین کی ساری مکاری اور چال بازی ختم ہو جائے گی۔ کوئی حیلہ و تدبیر ان کو اس بد انجامی سے نہ بچا سکے گی اور نہ ان کا مکر و فریب ہی انہیں کچھ نفع دے گا۔ اور نہ کوئی ان کی مدد ہی کر سکے گا۔ یعنی یہ معبودان باطل جن کی پرستش میں ان منکرین خدا کی ساری عمریں کٹ گئیں یہ اور ان کے فرضی معبود عذاب الہٰی کے مقابلہ میں کچھ بھی مدد نہ کر سکیں گے حاصل یہ کہ مقررہ دن آ کر رہے گا

اور یہ منکرین عذاب میں ضرور مبتلا ہوں گے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ خود ان منکرین کی تباہی و بربادی ہو گا۔ اور اس وقت کی پشیمانی بے سود ہوگی۔ تو بہ و انابت کا وقت تو یہی ہے۔ اگر وہ منکرین اس سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ

وَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ | اور بے شک جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے لئے

اس کے سوا (اور بھی) عذاب ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس عذاب سے مراد "یوم بدر" کا قتل ہے۔ ضحاکؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہفت سالہ قحط ہے اور براء بن عازب کا قول ہے کہ اس سے عذاب قبر مراد ہے۔ علامہ خطیب کہتے ہیں کہ "الآیۃ تحتمل ھذہ المعانی کلھا"۔ یعنی یہ آیت ان سب معنی کا احتمال رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی تفسیر میں یہ تینوں معنی ہو سکتے ہیں[1]۔ ان منکرین کی عقلوں پر پردے پڑ گئے ہیں ان کو حق سوجھائی نہیں دیتا وہ ایک خطرناک انجام کی طرف جا رہے ہیں۔

---

[1] تفسیر خطیب شربینی جلد چہارم صفحہ ۹۸۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	اور ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ وہ کس تباہی

و بربادی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاندین و مخالفین میں دو قسم کے لوگ تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و دیانت کا دل سے یقین تھا اور اس تکذیب حق اور انکار کے انجام کو وہ کچھ نہ کچھ سمجھے ہوئے تھے۔ مگر نفس و شیطان نے ان کے دلوں پر ضد و عناد کے پردے ڈال دئے تھے۔ جس کی وجہ وہ خود بھی حق کو قبول نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو بھی بہکاتے اور قبول حق سے روکتے تھے۔ مگر کثرت انہیں لوگوں کی تھی جو حقیقت اور اس کے انجام سے بے خبر تھے کہ ایک روز ان پر عذاب الٰہی نازل ہونے والا ہے۔

منکرین کو ان کا انجام بتا دینے کے بعد اب اپنے حبیب پاک کی طرف متوجہ ہو کر فرماتا ہے کہ

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ	آپ اپنے پروردگار کے حکم کا انتظار کیجئے۔ یہاں تک کہ وہ عذاب الٰہی

ان پر نازل ہو۔ جب عذاب الٰہی نازل ہوگا اس وقت ان معاندین کو آپ کی صداقت کا یقین ہو جائے گا۔ اگر یہ سمجھانے سے نہیں سمجھتے اور آپ کے درپے آزار ہیں تو یہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیوں کہ

فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا | بے شبہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں آپ جس دیانت و صداقت سے ہمارا

پیغامِ حق ان کو پہنچا رہے ہیں اور جس خوبی سے اپنی رسالت کے فرایض ادا کر رہے ہیں یہ بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ اور اس کے جواب میں منکرین آپ کے ساتھ جیسا برتاؤ کر رہے ہیں وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ ہم آپ کی اور آپ کے پیام رسالت یعنی دین اسلام کی پوری پوری حفاظت کریں گے ۔ ایک روز باطل ذلیل اور حق بلند و بالا ہو کر رہے گا۔ اس لئے آپ دل گیر نہ ہوں اگر یہ منکرین آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ ان کو چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ ہو جائیے اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کیجیے۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ | اور جب آپ کھڑے ہوں تو

اپنے پروردگار کی پاکی تعریف کے ساتھ بیان کیجے۔ اس آیت میں
تسبیح کے ساتھ "حین تقوم" کی قید بھی مذکور ہے۔ اس قید کے متعلق
سلف صالحینؒ اور اصحاب تفسیرؒ میں اختلاف ہے مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ
ہر مجلس سے اٹھو تو تسبیح کہا کرو۔ ابوالاحوص اس کی تفسیر میں کہتے
ہیں کہ "اذا قمت فقل سُبحانَ اللہَ بحمدہٖ" یعنی جب تم
کھڑے ہو تو سبحان اللہ بحمدہٖ کہا کرو۔ ابن ابی شیبہ۔
ابوداؤد۔ نسائی۔ حاکم۔ ابن مردویہ ابوبردہ اسلمی سے یہ روایت
نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر زمانہ میں جب
جب کسی مجلس سے باہر جانے کا ارادہ فرماتے تو یہ پڑھا کرتے تھے۔
سُبحانك اللّٰھم بحمدك اشھد ان لا الٰہ الا انت
استغفرك واتوبُ الیك"۔ ایک دفعہ اس کے متعلق ایک
شخص نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ اس سے پہلے تو
اس طرح نہیں فرمایا کرتے تھے جیسے اب فرمایا کرتے ہیں تو آپ نے
اس کو جواب دیا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں یہ کلمات ان کا کفارہ
ہیں۔ ابوالعالیہ سے بھی یہی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب کسی مجلس سے اٹھنے کا ارادہ فرماتے تو یہ پڑھا کرتے "سبحانك اللّٰھم وبحمدك اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفراللّٰہ واتوب الیك" فقیل یا رسول اللّٰہ ماھؤلاء الکلمات اللتی تقولھن قال ھن کلمات عَلّمنیھن جبرئیل کفارات لما یکون فی المجلس[1]۔

یعنی ابوالعالیہ کی اس روایت میں یہ زیادتی ہے کہ ان کلمات کی حضرت جبرئیلؑ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی اور یہ کلمات کفّارہ ہیں ان باتوں کا جو مجلس میں ہوئیں۔

حین تقوم کے دوسرے معنی — ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوں تو "سبحانك اللّٰھم بحمدك وتبارك اسمك وتعالٰی جدك ولا الٰہ غیرك" پڑھا کرو۔ سعید بن مسیبؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو اس وقت ان کلمات یعنی ثناء کو پڑھا کرو۔

[1] تفسیر درمنثور جلد ششم صفحہ ۱۲۰۔

حین تقوم کے تیسرے معنی

ابن مردویہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ "حین تقوم من فراشك الی ان تدخل فی الصلوٰۃ" یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ نماز کے لئے جب تم بستر سے اُٹھو تو یہ تسبیح کہا کرو۔

ان تینوں روایتوں میں اس طرح تطبیق ہوسکتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے صرف نماز میں تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ مگر بعد میں آپؐ ہر مجلس بلکہ بستر سے اُٹھتے وقت بھی تسبیح پڑھنے لگے اور فرمایا کہ یہ کفارۂ مجلس ہے اور بعض روایتوں میں یہ صراحت ہے کہ یہ تسبیح لَغَطِ مجلس کا کفارہ ہے اور لغَط کے معنی شور و پکار کے ہیں۔

تسبیح کے لفظی معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ کسی کی تسبیح و تحمید کا محتاج نہیں البتہ پاکی بیان کرنے والے یا تو عوام ہوں گے یا خواص۔ اگر وہ عوام اور گناہ گار ہیں تو تسبیح سے اون کی روحیں گناہوں کی آلودگی سے پاک ہوں گی۔ اور اگر خواص ہیں تو ان کی روحوں کا اشراق و نورانیت زیادہ ہوگی جس کے آثار

ان کے چہروں سے بھی ظاہر ہونے لگیں گے۔ ہر مجلس سے اٹھتے ہوئے کفارۂ مجلس کی تسبیح کی تعلیم اس لئے دی گئی ہے کہ جب چند مسلمان ایک جا جمع ہوں گے اور آپس میں مختلف قسم کی گفتگو ہو گی تو ان باتوں کے انہماک سے ایک قسم کی غفلت ہو گی جس کے اثر کو دور کرنے کے لئے بطور کفارہ تسبیح کی تعلیم دی گئی ہے۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کی معصیت اور ایسی غفلت سے ہر طرح پاک و منزہ ہیں اس لئے سرکارؐ کی تسبیح کو اپنی تسبیح پر مت قیاس کرو بلکہ یہ سمجھو کہ آپؐ چوں کہ خلق کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں اس لئے خلق کی دعوت و تعلیم آپ کے فرائض نبوت میں داخل ہیں۔ اس لئے آپ کو اپنے فرض منصبی کی ادائی کے لئے بحکم خدا خلق کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری تھا اور اس توجہ کے وقت بھی آپ اگرچہ آپ کو خدا کی طرف سے کوئی غفلت نہیں طاری ہوتی مگر آپ کی اس حالت سے آپ کی وہ حالت جس میں آپ صرف خدا ہی کی طرف متوجہ رہتے تھے ہر طرح افضل و اولیٰ ہے لہذا آپؐ اس ترک اَولویت کا اثر اپنی روح انور پر محسوس فرماتے تو

اس کے دور کرنے کے لئے تسبیح کہا کرتے۔ اس مثال کو پیش نظر رکھو
کہ کپڑا جتنا زیادہ سفید ہوگا اسی لحاظ سے اس پر ذرا سے گرد و غبار
کا اثر بھی محسوس ہو گا۔ دیکھو جب کوئی چیز نہایت صاف اور اعلیٰ
درجے کا صیقل کی ہوئی ہو تو اس کو خواہ کتنے ہی پاک و صاف ہاتھوں
سے مس کیا جائے اس پر ایک ہلکا سا اثر محسوس ہو گا۔ پس حضورؐ
انور کے ہر مجلس سے برخاست فرمانے کے وقت تسبیح پڑھنے کا مقصد
اسی عارضی غبار کو دور کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ اور آپ کے غلامان خاص
جب تسبیح پڑھتے ہیں تو ان کی تسبیح کا مقصد اشراق و نورانیت کی
زیادتی ہوتا ہے۔ اور ہم گناہ گار معصیت کی آلودگی سے پاک ہونے
کے لئے تسبیح پڑھا کرتے ہیں۔

اس کے بعد اپنے حبیبؐ پاک سے ارشاد مبارک ہوتا ہے

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ	اور ستاروں کے غائب ہونے کے بعد رات کے کچھ حصے میں بھی خدا کی تعریف و

تسبیح کیجئے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دو رکعت

نماز صبح سے پہلے پڑھیں ۔ حافظ ابن جریرؒ اور ابن
ابی حاتم حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سے
مراد فجر کے دو رکعت ہیں ۔ اور ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد
نماز صبح ہے ۔ حافظ ابن جریر لکھتے ہیں کہ یہی قول زیادہ درست
ہے ۔ اور "حین تقوم" سے مراد قیلولہ کی نیند سے اٹھنا ہے
کیوں کہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ نماز صبح میں سبحانك
اللھم پڑھنا واجب نہیں ہے لہذا اللہ تبارک و تعالیٰ نے
جب یہ حکم دیا کہ " وسبح بحمد ربك حین تقوم بالتسبیح
بعد ادبار النجوم " یعنی ستاروں کے غائب ہونے کے
بعد بھی آپ پاکی بیان کیجیے تو اس حکم سے فجر کے دو رکعت نماز
مراد ہوئی جس کو عموماً لوگ رات کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد
پڑھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہاں نیند سے اُٹھ کر نماز پڑھنے
کے بعد بھی کوئی فرض نماز ہے اور وہ فرض نماز سوائے ظہر کے اور
کون سی ہو سکتی ہے ۔ اس لئے ہم (یعنی حافظ ابن جریر) نے
قیلولہ سے بیدار ہونا مراد لیا ہے ۔

ادبار النجوم کی تفسیر میں حافظ ابن جریر نے دو روایتیں لکھی ہیں۔ ایک روایت عطا کی ہے کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں "ادبار النجوم سے مراد فجر سے پہلے کی دو رکعت ہیں"۔ اور دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ادبار النجوم کی تسبیح سے مراد صبح کی فرض نماز ہے۔ ضحاکؒ اور ابن زید کی روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد فجر کی نماز ہے حافظ ابن جریر لکھتے ہیں کہ ان دونوں میں وہی قول اولیٰ ہے جس میں فجر کی فرض نماز مراد لی گئی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب اٹھو تو خدا کی تسبیح۔ اور ستاروں کے غائب ہونے کے بعد بھی اور وہ دو رکعت نماز جو فجر سے پہلے پڑھی جاتی ہے واجب نہیں ہے اور ایسی کوئی دلیل بھی نہیں قایم ہوئی جس سے یہ ثابت ہو کہ فسبحہ کا حکم ندب کے لئے ہے۔ اور ہم (یعنی ابن جریر) کئی جگہ ثابت کر چکے ہیں کہ حکم عموماً فرض کا افادہ کرتا ہے۔

حافظ ابن جریر کی اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حین تقوم سے مراد یہ ہے کہ جب آپ قیلولہ کی نیند سے بیدار ہوں تو ظہر کے فرض

پڑھیں کیوں کہ "سبّح" امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کا فائدہ دیتا ہے اس لئے تسبیح سے یہاں ثناء یا نماز سنت مراد لینا درست نہیں لہذا اس تسبیح سے ظہر کے فرض مراد ہیں اس لئے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد دو ہی فرض نمازیں پڑھی جاتی ہیں :-

(۱) رات کی نیند سے جاگنے کے بعد صبح کے فرض جو ادبار النجوم کی تسبیح سے ظاہر ہوتے ہیں۔

(۲) قیلولہ کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد ظہر کے فرض۔ لہذا

اس آیت سے امام طبری نے ظہر و فجر دو وقت کی فرض نمازیں مراد لی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ :-

تم اپنے پروردگار کی فرض نمازوں کو اخلاص کے ساتھ ادا کرو اور صبح و شام اپنے اس مالک کے ذکر سے غافل نہ رہو جو کبھی اپنے انعام سے غافل نہیں ہوتا۔ اور ہر وقت تمہاری حفاظت فرماتا ہے۔

الحمد للہ

کہ سورۂ طور کی تفسیر ختم ہوئی اور اسی پر ساتویں جلد بھی ختم ہو رہی ہے۔

اب تفسیرِ قادری کی آٹھویں جلد سورۂ نجم کی تفسیر سے شروع ہوگی انشاء اللہ المستعان وعلیہ التکلان

الارادۃ منّی والاتمام من اللہ۔

